خواب دان



اختر رضا سلیمی

خواب‌دان

خواب دان

نظمیں

اختر رضا سلیمی

نام کتاب	:	خواب دان
شاعر	:	اختر رضا سلیمی
ٹائیٹل	:	وصی حیدر
ڈیزائننگ	:	قمر الزمان
کمپوزنگ	:	عابد محمود
تعداد	:	500
سالِ اشاعت	:	2013ء
مطبع	:	
قیمت	:	160روپے

رابطہ:

اختر رضا سلیمی، پاکستان ریسٹورنٹ، گولڑہ موڑ، پشاور روڈ راولپنڈی

ایڈیٹر اردو، اکادمی ادبیات پاکستان H-8/1، اسلام آباد

فون:- 0300 5171427 ای میل: ar.saleemipal@gmail.com

وجدان سلیم
عثمان یامین
ایان رضا سلیمی
اور
نعمان جاوید
کے نام

وہ نظم ہو غزل ہو کہ باتیں ہوں یار کی
جو بھی کہا ہے ہم نے کہا ہے سنوار کے

فہرست

OOO

عالمی گاؤں کی شاعری

اختر رضا سلیمی کی نظمیں پڑھتے یا سنتے ہوئے ذہن میں اوّلین تاثر یہ بنتا ہے کہ یہ آج کی شاعری ہے ۔۔۔یعنی عالمی گاؤں کی شاعری۔زیرِ نظر مجموعے کی نظمیں اختر رضا سلیمی کے عالمی شعور اور تخیل کا پتہ دیتی ہیں۔ہم یہ بھی جان لیتے ہیں کہ اِن نظموں میں روحِ عصر اپنا اظہار پا رہی ہے۔

اظہار کے پیچھے تلاش بھی ہے کہ ہمارا شاعر کسی نئے نویلے منظر پر، جو پہلے کبھی کسی آنکھ پر نہ اُترا ہو، نظر سے دستخط کر کے ابدآثار، ہونے کا آرزو مند ہے۔اس جستجو میں اختر رضا سلیمی نے ایسے سوال اُٹھائے ہیں جو اردو شاعری میں پہلی بار پوچھے گئے ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ وہ 'کن' سے پہلے کی صورتِ حال کی کھوج میں ہے تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جاننا چاہتا ہے کہ اِس جہانِ رنگ و بو کے حسن و جمال میں انسان کا کنٹری بیوشن کیا ہے۔۔وہ پانچویں بُعد (Dimention) کا متلاشی بھی ہے اور آخر کار دکھ کو طویل و عریض و عمیق و قدیم کائنات کے پانچویں بُعد کے روپ میں پالیتا ہے۔

شاعر کے جہانی نقطۂ نگاہ میں بنیادی حیثیت تغیر کو حاصل ہے وہ یقین رکھتا ہے کہ:

ہزار بار بھی گر ہاتھ ہم بڑھائیں گے
ہم ایک لہر کو دوبارچھو نہ پائیں گے

اور یہ کہ:

سرور و کیف کے یہ سلسلے کوئی دم ہیں
ہم اگلے پل وہ نہیں ہوں گے جو ابھی ہم ہیں

لہٰذا اُس کا پیغام یہ ہے کہ لمحۂ موجود کی اہمیت کو پہچانا جائے اور جہاں تک ہو سکے اُس کے امکانات کو احاطۂ عمل میں لایا جائے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ دوبارہ ملنا کسی طور بھی نہیں ممکن، دوبارہ ملنے کا وعدہ بس فریب ہی ہے۔

زندگی کا بھید جاننے اور زندگی کو قبول کرنے والی یہ شاعری نئی، منفرد اور دلفریب ترکیبوں میں سامنے آئی ہے۔ آیئے اس کو خوش آمدید کہیں۔

قاضی جاوید

۱۰ نومبر ۲۰۱۲ء

اختر رضا سلیمی کی نظم

اردو غزل میں اپنی الگ پہچان قائم کرنے کے بعد، اختر رضا سلیمی نے نظم کی طرف توجہ کی ہے۔ ان کی نظم کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس پر نہ تو غزل کی شعریات کا سایہ ہے اور نہ غزل کے مخصوص ڈکشن کا۔ ہر چند انھوں نے اپنی پابند اور آزاد نظموں میں اندرونی قوافی سے خاصا کام لیا ہے، مگر اسے ہم غزل کا اثر نہیں، نظم میں قافیے کے ذریعے غنائیت کی تخلیق کا ایک سلیقہ کہہ سکتے ہیں۔ (نظم کے غنائی عنصر کو ہماری معاصر نظم عموماً نظر انداز کرتی ہے۔) وہ اپنی نظم کے اسلوب کو تازہ اور غیر تقلیدی لفظیات سے مزین کرتے ہیں۔

اختر رضا سلیمی کی نظم معاصر عہد کی ترجمانی (عکاسی نہیں) کرنے کی ذمہ داری قبول کرتی ہے جو پیچ در پیچ ہے۔ اس عہد میں محسوس حقیقتوں سے زیادہ وضعیں اور تشکیلات ہیں جو میڈیا اور سوشل میڈیا کے ذریعے اپنا اظہار کرتی ہیں اور ہماری سماجی اور داخلی دنیاؤں میں محسوس حقیقتوں سے زیادہ ہلچل پیدا کرتی ہیں اور ہمیں اپنے وجود کو ازل سے درپیش سوالات کی آنچ سے دور لے جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب ہم ایک حقیقی دنیا کے نہیں، ایک تشکیلی دنیا کے شہری ہیں۔ اس دنیا نے ہمارے زمان و مکاں، اظہار و ابلاغ، فرد و سماج کے تعلقات، یہاں تک کہ عشق اور انسانی وجود کو لاحق ازلی سوالات کے سلسلے کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ اختر رضا سلیمی کی

نظم جن انسانی احساسات کی تجسیم کرتی ہے، وہ اسی تشکیلی دنیا کے شہری کے احساسات ہیں۔ یہ احساسات ہم آہنگی اور موافقت کے تجربات کے زائیدہ نہیں؛ ان میں ایک کش مکش پائی جاتی ہے جو 'کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے' کی کش مکش سے مختلف ہے۔ ان کی نظم کا متکلم قدیم زمانوں (خاص طور پر اساطیری اور مذہبی صداقتوں کے زمانوں) اور 'معاصر تشکیلی عہد' کے بیچ کسی نئے آہنگ کی تلاش میں دکھ جھیلتا اور تنہائی بسر کرتا ہے۔

ناصر عباس نیّر

نظمیہ متون کی بافت اور منطقۂ پراسراریت

تخلیقی متن کے تارو پود کی بافت اس کی جملہ جہات کی پیش کار بھی ہوتی ہے اور اس کے جملہ اسرار کی پردہ دار بھی۔ متن تخلیقی پُراسراریت کے کس درجہ پر فائز ہے اس کا اظہار خود متن ہی سے ہوتا ہے۔ تاہم متن کے تارو پود کی بافت اس عمل کے بغیر ممکن نہیں جسے تخلیقی عمل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس عمل کے کلی اجزائے ترکیبی کا تعین ممکن نہیں بالخصوص اس قدر کا تعین انتہائی دقیق ہے جسے اس عمل کے حقیقی جوہر سے تعبیر کیا جا سکے مگر اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اس عمل کی پراسراریت اس کے اجزائے ترکیبی میں مضمر نہیں ہوتی۔ اب تک تخلیقی عمل کے جن اجزائے ترکیبی کو دریافت کیا گیا ہے ان کے تناظر میں تخلیقی متون کا تجزیہ یہ احساس دلاتا ہے کہ تقریباً تمام تخلیقی متون اس عمل کے معلوم اجزائے ترکیبی سے معمور ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ یک سانیت ظاہر نہیں ہوتی جو مشترک اجزائے ترکیبی کا لازمی نتیجہ ہو سکتی ہے۔ ہر تخلیقی متن اپنی پراسراریت کا ایک الگ نظام وضع کرتا محسوس ہوتا ہے اور یہ تاثر ابھارتا ہے کہ وہ دیگر متون سے کسی قدرِ مشترک کا حامل نہیں جب کہ تخلیقی متن کی انفرادیت تخلیقی عمل کے اجزائے ترکیبی میں نہیں اس نسبت ترکیبی میں ہوتی ہے جسے تخلیق کار بروئے کار لاتا ہے یہی عمل اس منطقۂ پراسراریت کا تعین کرتا ہے جس پر تخلیقی متن کی شرح معنی یابی اور مقدارِ حظ آفرینی کا انحصار ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ طے ہے کہ تخلیقی متن کے تارو پود کی بافت تخلیق کار کی مرہون ہوتی ہے۔ تخلیق کار کا شعور، تخلیقی عمل، اس

عمل کے اجزائے ترکیبی اور ان اجزاء کی نسبت ترکیبی کی بابت جتنا گہرا ہوگا، تخلیقی متن اتنا پراسرار، کثیرالمعنی اور حظ آفریں ٹھہرے گا۔

میراجی سے اختر رضا سلیمی تک کے تخلیقی متون کا مطالعہ یہ باور کراتا ہے کہ نظم گو شعراء نے انفرادی منطقہ پراسراریت تک رسائی کے جملہ مراحل کو گہرائی سے سمجھنے کے ساتھ وہاں تک رسائی کو بھی پوری سنجیدگی سے لیا ہے اور اکثر شعراء اس کے حصول میں کام یاب ٹھہرے ہیں لیکن اگر ان شعراء کو فہرست سے الگ کرلیا جائے جنھوں نے نظم اور غزل دونوں کو وسیلہ اظہار بنایا ہے تو یہ امر متعجب معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شعراء اس توانا شعور کی حامل شخصیت سے محروم نظر آتے ہیں جو ان اصناف کے برتاوے میں توازن پیدا کرتی ہے جس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ اکثر شعراء نے ان اصناف کے مابہ الامتیاز کو تخلیقی شخصیت کی کلیت پر مقدم تصور کیا ہے جس کے باعث ان کے غزلیہ اور نظمیہ متون سے ظاہر ہونے والی شخصیت دولختی کا اظہار بن کررہ جاتی ہے۔ اختر رضا سلیمی ان معدودے چند شعراء میں شامل ہے جو اس نکتے کو بہ خوبی سمجھتے ہیں کہ اصناف کا مابہ الامتیاز تخلیقی شخصیت کی کلیت پر مقدم نہیں ہوتا بہ شرط یہ کہ تخلیقی شخصیت اپنی تعمیر کے ان اساسی عناصر کی حامل ہو جن کے بغیر اس کی وجودی شناخت متعین نہ کی جاسکے۔ اختر رضا سلیمی اپنی شخصیت کے ان عناصر سے بہ خوبی آگاہ ہے اس لیے بہ حیثیت نظم گو اپنا تعارف کراتے ہوئے وہ ان مسائل کو نظر انداز نہیں کرتا جن پر غور و فکر کے زاویہ ہائے کثیر کے ساتھ وہ بہ طور غزل گو اپنی شناخت قائم کرچکا ہے۔

زمیں پہ نہ فلک پہ دکھائی دیتا ہے
جو اپنی ذات کے اندر دکھائی دیتا ہے

......

نہ جانے کیا ہے کمی اس جہان میں اختر
جو ایک بار گیا لوٹ کر نہیں آیا

......

تو نہ ہوتا تو کوئی تجھ سا ضروری تھا

تو ہمارے واسطے گویا ضروری تھا

......

جوں جوں ترے وجود کا بڑھتا گیا یقین

میں بد گمان ہوتا گیا اپنے آپ سے

......

تجھ سے تو بچھڑ کے میں

خود سے بھی ملا نہیں

تو مرے سوا بھی ہے

میں ترے سوا نہیں

......

بہت کٹھن تھا رضا اپنا سامنا کرنا

کئی زمانے لگے حوصلہ بنانے میں

......

آخرش خود تک آن پہنچے ہیں

جو تری جستجو میں نکلے تھے

......

خیالِ کوزہ گری پہ لرز سا جاتا ہوں

میں آپ ٹوٹ نہ جاؤں تجھے بناتے ہوئے

......

دل و نگاہ پہ طاری رہے فسوں اس کا

تمہارا ہو کے بھی ممکن ہے میں رہوں اُس کا

تجھے خبر نہیں اِس بات کی ابھی شاید
کہ تیرا ہو تو گیا ہوں مگر میں ہوں اُس کا

......

دیکھو یہ دیکھنا بھی کہیں رائیگاں نہ ہو
جس پر نظر ہے مرتکز اُس کا نشان نہ ہو

......

غبار رایگانی میں گھرا تھا
میں تجھ سے آشنا ہونے سے پہلے
اندھیرا ٹمٹماتا تھا وہاں پر
ستارا رونما ہونے سے پہلے

......

خیالِ رفتگاں گھیرے ہوئے ہے
میں تنہا ہو کے بھی تنہا نہیں ہوں

......

میں اپنے کھوج میں نکلا تھا سائیں
زمانہ ہو گیا پلٹا نہیں ہوں

......

کہاں سے آئے ہیں ہم لوگ یہ نہیں معلوم
مگر یہ طے ہے بہر حال اس جہاں کے نہیں

......

بس ایک ہیولیٰ سا نظر آتا ہے سب کو
میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟ کسی پر نہیں کھلتا

......

مجھے دکھائی گئی پہلے لا مکاں کی جھلک
پھر اس کے بعد اسیر مکاں بنایا گیا

......

میں اس کو تلاش کر رہا ہوں
وہ جو نہیں بھی ہے اور ہے بھی

......

مجھ کو کوئی بھی دھیان میں لایا نہیں ابھی
سو معرض وجود میں آیا نہیں ابھی

......

یہ برتری تو بہر حال اُس کا حاصل ہے
کہ آئنے نے ترا سامنا زیادہ کیا
ذرا اندھیرا چھٹے تو کھلے زمانے پر
مرے چراغ سے کس کس نے استفادہ کیا
میں خود سے ملنے پہ آمادہ ہی کہاں تھا ابھی
ملا جو تجھ سے تو پھر ملنے کا ارادہ کیا

......

وقت کا یہ دائرہ ممکن ہے یوں بنتا نہ ہو
ہم جسے ماضی سمجھتے ہیں کہیں فردا نہ ہو
ڈھونڈ اے چشم تمنا ایسا نظارہ کوئی
تجھ سے پہلے جو کسی بھی آنکھ نے دیکھا نہ ہو

......

وہ مری روح میں اُترا تو یوں لگا جیسے
مرا وجود زمان و مکاں سے باہر ہے

......

میں خود کو دیکھنا چاہوں تو وہ نظر آئے
اب اس کے نقش مرے چہرے سے ابھر آئے

ہو رہا ہے کسی کے ہونے کا گماں
کیا کوئی میرے سوا موجود ہے

......

میں ایک آیتِ آئندہ ہوں رضاؔ صاحب
مرے نزول کا لمحہ ابھی نہیں آیا

اختر رضا سلیمی نے اپنے مسائل کو غزلیہ متن کے تار و پود میں اس شائستگی اور خوش سلیقگی سے پرو دیا تھا کہ یہ بات چشم تخیل تک میں عکس ریز نہ ہو پائی تھی کہ اسے اپنے اظہار کے لیے کسی دوسری صنف کی احتیاج بھی ہو سکتی ہے جس کی ایک وجہ اس کے تعارف کا ابتدائی غزلیہ حوالہ بھی تھا اور اس کا وہ اعتماد بھی جو اس نے شہر نظم میں غزل اختیار کر کے ظاہر کیا تھا مگر اس کی حقیقی وجہ اس کے مسائل اور شعریات غزل کی وہ ہم آہنگی تھی جو اسے ایک طرف اپنے مسائل کی گہری آگاہی سے بہرہ مند ثابت کرتی تھی تو دوسری طرف غزل کی روایت اس کی اٹوٹ وابستگی کا احساس دلاتی تھی اس لیے گمان تک نہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے فکری مسائل سے مکمل مناسبت رکھنے والی غزل کے علاوہ کوئی دوسری صنف بھی اختیار کر سکتا ہے۔" اختراع'' سے ''ارتفاع'' تک کا سفر اس نے شعور کی جس بالیدگی سے طے کیا تھا اس سے دو طرح کی حقیقتیں ظاہر ہوئی تھیں۔

اول: اس نے شاعری کو اپنے بنیادی مسائل کے حوالے سے بعض اساسی استفہامیوں پر غور وفکر کے لئے اختیار کیا ہے۔

دوئم: غزل وہ واحد صنف ہے جو اب تک اس کی فکری پیش رفت کے لیے ہر اعتبار سے موزوں ہے۔

''خواب دان'' اس کا تیسرا شعری پڑاؤ ہے جس میں وہ اپنا اظہار نظم کے ذریعے کرتا نظر آتا ہے۔ اس مجموعے میں شامل نظمیہ متون کی سرسری اور سطحی قرأت کوئی ایسا جواز مہیا نہیں کرتی جسے غزل کی جگہ نظم اختیار کرنے کا تخلیقی موجب قرار دیا جا سکے لیکن اگر ان نظموں کی قرأت اکریونٹ قاری کی جگہ اکریوین قاری کی طرح کی جائے تو وہ وجوہات جلی طور پر ظاہر ہونے لگتی ہیں جنھیں اختر رضا سلیمی کا نظمیہ جواز قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے غزلیہ متون کی طرح اس کے نظمیہ متون سے ظاہر ہونے والا مسئلہ، وجود کے معنی کی دریافت ہے مگر اس عمل دریافت کے لیے اب صرف وہ منطقے کافی نہیں رہے، جو اس کے غزلیہ متون کا امتیاز تھے۔ اب وہ ایک ایسے منطقے میں وجود کے معنی دریافت کرتا نظر آتا ہے جہاں تک رسائی اس فکری ارتقاء کے بغیر ممکن نہ تھی جو اس نے اپنے غزلیہ سفر کے ذریعے حاصل کیا ہے۔ وقت کا منطقہ تو اس کے غزلیہ متون میں بھی ظاہر ہوا تھا مگر اب اس منطقے کے ساتھ ناوقت کا منطقہ بھی اس کی تخلیقی تمناؤں کی آماج گاہ ہے بلکہ اس کا زورِ تخیل کئی مقامات پر اس کی اس منطقے تک رسائی کی دلالت کرتا نظر آتا ہے۔

کل کنج شگفت جاں میں میری
کچھ دیر کو آنکھ لگ گئی اور
چپ چاپ گزر گیا وہ لمحہ
صدیوں سے میں جس کا منتظر تھا
جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا

ہر سمت شے کی دھجیاں تھیں
شیرازۂ وقت منتشر تھا
لیکن میں وجود پر مصر تھا

(ناوقت میں اثبات وجود)

یہ نظمیہ متن جس وسیع تر فکری تناظر میں ''وجود پر اصرار'' کرتا نظر آتا ہے اس کیلئے ظرف غزل کافی نہیں اس لیے نہیں کہ شعریات غزل اس وسیع تر فکری تناظر کی پیش کش کی اہل نہیں بلکہ اس لیے کہ اختر رضا سلیمی اپنے قاری کو اپنی دریافت کے سفر میں جن تفصیلات کے ساتھ شامل سفر رکھنے کا خواہش مند ہے وہ شعریات نظم کا خاصا ہے۔ منطقۂ ناوقت تک اس نے جتنا فکری سفر کیا ہے اس میں اس کی صنف بھی تبدیل ہوتی ہے اور صنفی تقاضوں کے پیش نظر اس کا فنی رویہ بھی بعض تغیرات سے دو چار رہا ہے مگر یہ جزوی بدلاؤ صفات کی تبدیلی ہے جوہر کی نہیں۔ پابند، معریٰ اور آزاد ہیئتوں کے ساتھ طویل مصرعے اور بعض نظموں میں ترتیب الفاظ کو نثر کے قریب تر رکھنے کی کوشش نے اختر رضا سلیمی کے لئے نثری نظم کے آہنگ تک رسائی کو بھی ممکن بنایا ہے۔ اس ذیل میں ''سی این این''، ''کوئی شارع بھی شارع عام نہیں ہے'' اور ''میڈیا آزاد ہے'' خصوصی توجہ کی مستحق ہیں مگر اس کے نظمیہ متون کا جوہر اس کے وجودی معنی کا عمل تلاش بھی ہے اور اس کی معنویت کا عمل دریافت بھی اس لیے اس کا مسئلہ موجود بھی ہے اور ناموجود بھی، معلوم بھی اور نامعلوم بھی۔ وہ اپنے وجود کو موجودگاں سے مغائر بھی محسوس کرتا ہے اور رفتگاں اور آئندگاں سے اس کے زاویہ ہائے اتصال کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ وجود کے معنی و معنویت کی تلاش اسے وقت اور کائنات کے مقابل اور ان منطقوں کے مابین بھی سرگرداں رکھتی ہے اور وہ ان کی تلاش میں ناوقت اور لا کائنات کا سفر بھی اختیار کرتا نظر آتا ہے مگر ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس بھی اسے ہمہ وقت بے چین کیے رکھتا ہے جس کے بغیر نہ تو اس کے وجود کے معنی قائم ہو سکتے ہیں نہ اس کی معنویت۔ یہ دوسرا جو اس کا خدا بھی ہے، محبوب بھی اور اس کا ہم زاد بھی، اس

کے وجود کے لیے لازم و ملزوم ہے ۔ اس کا اظہار وہ کبھی تجسیم کے ذریعے کرتا ہے تو کبھی کسی احساس میں اس کی تقلیب، اس کی بے ہیئتی اور تجرید کا اظہار بن جاتی ہے ۔ یہ دوسرا اس کے وجود کے معنی اور معنویت سے سلسلۂ ہائے کثیر کا حامل ہے جو اس کے نظمیہ متون میں بار بار ورود کرتے ہیں ۔ اس دوسرے کے علاوہ زندگی، موت، روشنی اور اندھیرے کی ثنویتیں بھی ان منطقوں کی حیثیت سے اظہار پاتی ہیں جن کے مابین معلق ہونے کی کیفیت اور فیصلہ نہ کر سکنے کی معذوری ان نظمیہ متون کی حسی فضا تشکیل دیتی ہیں ۔ روشنی اور اندھیرا اختر رضا سلیمی کی جستجو کے معاونات اور حاصلات کے روپ میں جلوہ گری کرتے ہوئے اندھیرے کو اپنی وسعت میں غور و فکر پر اکسانے کی صلاحیت سے بہرہ مند ثابت کرتے ہیں اور اسے اس کی تخلیق کا محرک بناتے ہیں جب کہ روشنی کو اس استعارے کا روپ عطا کرتے ہیں جو اس کے منزل سے قریب تر ہونے کی سرشاری کا اظہار کرتا ہے ۔ اختر رضا سلیمی کو اپنے مرکزی مسئلے کے بین العلومی ہونے کا قوی ادراک ہے لہٰذا وہ مابعد الطبعیات، تاریخ، مذہب، متھ، فلسفہ اور سائنس سے تخلیقی استفادے کے لیے ہمہ وقت تیار و بیدار رہتا ہے مگر اس کی وافر تخلیقی استعداد اصطلاحی زبان کو شعری زبان سے اور علمی منطق کو شعری منطق سے اس خوبی سے ہم آمیز کرتی ہے کہ دوئی کا احساس تک باقی نہیں رہتا ۔

اختر رضا سلیمی کے تخلیقی رویے اور اس کی نظمیہ متون کی فکری بافت کو سمجھنے کے لیے بعض نظمیہ متون کا طائرانہ تجزیہ لازم ہے ۔

"منظر اک بلندی پر" ایک ایسے مقام کی جستجو سے عبارت ہے جو رفتگاں کی فکری و تخلیقی انفرادیت کے نقوش سے گرد آلود نہ ہو ۔ اس نظم کا شعری متن ایک ایسے علاقے کی خواہش کا اظہاریہ ہے جو نظم میں موجود کردار کی تخلیقی انفرادیت کے اظہار کے لیے مکمل طور پر ہموار اور تیار ہو، تا کہ وہ اپنے حقیقی معنی وہاں ثبت کر کے ابد آثار ہو سکے ۔

میں بھی اک منظر پر اپنا آپ لکھنے آیا ہوں

لیکن کہاں لکھوں

یہاں

سب منظروں پر گرد ہے

گزرے ہوئے لوگوں کی بینائی کی گرد

میں کسی شفاف منظر پر

نظر سے دستخط کر کے ابد آثار ہونا چاہتا ہوں

ایسے اِک منظر پہ جو پہلے کسی بھی آنکھ پر اترا نہ ہو

"شجر وسیلہ ہے" پیڑ کے اس مذہبی، تاریخی تناظر کو پیش کرتی ہے جس میں ذات کے عرفان کی جستجو، اس عرفان کے لیے دوسری ذات سے مکالمہ اور عرفان ذات تک رسائی کے مراحل کی سخت کوشیاں سمٹ آتی ہیں مگر یہ نظمیہ متن المیہ وجود کو موجودہ عہد میں پیڑ کاٹنے کی روش سے مربوط کرتے ہوئے معاصر زمانے میں انسانی وجود کی بے معنویت کا سراغ دیتا ہے اور یہ احساس دلاتا ہے کہ وجود کے معنی تک عدم دست رس آج کے انسان کا مقدر اس لیے بن گئی ہے کہ وہاں تک رسائی کیلئے دعا کا وسیلہ لازم ہے جو گرد آلود ہو چکی ہے اور اوزون کی تہہ کی درزوں میں اٹکی ہوئی ہے۔ پاک خدا تک اس کی رسائی ممکن نہیں کیوں کہ وہاں تک رسائی کے لیے دعا پیڑ کی محتاج ہے۔

یہی موضوع معنویت وجود کو بارانِ رحمت کے استعارے میں منقلب کرتے ہوئے "ایک نظم درختوں کے لیے" کی تخلیق کا بھی محرک بنتا نظر آتا ہے۔

"Event Horizon" بنیادی طور پر "مادے" کی "توانائی" میں تقلیب کے سائنسی مفروضے کو "وقت" سے "ناوقت" اور "کائنات" سے "لاکائنات" تک کی رسائی کے لیے تخلیق کا وسیلہ بناتی ہے یہ متن وجود کے معنی کی تسخیر کے لیے معدومیت کے اندھیرے کے قرن ہا قرن سفر کو چند لمحوں میں عبور کرنے والے اس کردار کی رُوداد سناتا ہے جو لا

کائنات میں ظاہر ہونے والی اس حقیقت تک رسائی پالیتا ہے جہاں زندگی محض خواب اور پردے کی صورت ؛وجوداوراس کی معنوی حقیقت کے مابین سے ہٹ جاتی ہےاوروجود کے معنی صاف اورنمایاں نظر آنے لگتے ہیں۔''موت'' بھی معنوی اعتبار سے اسی قبیل کی نظم ہے۔

''تجسیم' کامتن ایک ایسے کردار کوپیش کرتا ہے جوناوقت کے سمندر کے اسرار کووقت کے منطقوں کے ذریعے معرض تفہیم میں لانے کی جستجو کرتا ہے مگرناوقت اسے احساس دلاتا ہے کہ وہ جس اسرار کی تلاش میں ہے اورجس کی جستجو نے اس کی بینائی کوفرد اکی اندھی گھپامیں قید کرکے رکھا ہے وہ بے جان ذرے کی تسخیر میں نہیں بلکہ ناوقت کی تسخیر میں ہے۔ جووجود کی اصل اورزندگی کا جوہر ہے۔

''مستقبل کو یادرکھنے کی خواہش'' ناوقت کے ازل گیراورابدآثار لمحے کی جستجو کے ساتھ نظم کے کردار پراس دوسرے کے وجودی انکشاف سے عبارت ہے جواس کی اپنی معرفتِ وجود کے لیےلازم ہے۔وقت کی غیرمعمولی اہمیت اختر رضاسلیمی کے نظمیہ متون میں بلاجواز نہیں۔

یہ ماضی، حال، مستقبل بھی تیرے زمانے ہیں
ترافرمان ہے ''میں خودزمانہ ہوں''
لہٰذاتوزمانہ ہے

....

مری آنکھوں میں ماضی کے سوا کچھ بھی نہیں
اگر ہے بھی تومستقبل کااندیشہ
ولیکن میں جنون پیشہ
تجھےاچھابرا کہنے نہیں آیا

''دائرہ'' اور''تغیر'' کے نظمیہ متون زمان ومکاں کے تصورات کی تخلیقی پیش کش سے صورت پذیر ہوئے ہیں یہ متون ان نظموں کے بنیادی کردار کے تصوروقت اورتصورمکاں کو سمجھنے

میں قاری کی معاونت کرتے ہیں اور یہ احساس دلاتے ہیں کہ اس کردار کے لیے اپنے وجود کو تغیر وقت اور تصور رفتگاں سے الگ کر کے سمجھنا قطعی ناممکن ہے ایک طرف یہ نظمیہ متون ساعت گذشتہ کو نا وقت کا روپ عطا کرتے ہیں تو دوسری طرف انسانی وراثت کے علمی رخ کو تخلیقی قالب میں ڈھالنے کی کام یاب سعی، رواں اور مترنم پیرایۂ اظہار کے باوجود ان متون کا حقیقی حسن ان کی فکری بافت میں پوشیدہ ہے۔

''کن سے پہلے کا جہاں'' وجود کے معنی سے زیادہ اس کی معنویت پر اصرار کرتی ہے اس متن کا کردار کُن سے پہلے کے جہاں تک رسائی طلب کرتے ہوئے تاریخ کی وہ گم شدہ کڑیاں تلاش کرنا چاہتا ہے جن کی گم شدگی کے باعث انسانی وجود کی معنویت مکمل طور پر معدوم ہو چکی ہے۔

''پانچواں بعد'' کا متن بھی انھی گم شدہ کڑیوں کی تلاش سے عبارت ہے جنھوں نے وجودی معنویت کی ڈوریاں الجھا رکھی ہیں۔

''ایک کہانی'' بظاہر حیرت کے اس احساس کو ابھارنے کی کوشش کرتی ہے جو اس متن کے کردار کے لیے زندگی کے مترادف ہے اور جس کا زیادہ واضح اظہار نظم ''حیرت زندگی ہے'' کے متن سے ہوتا ہے۔ مگر یہ نظم آواز کے سفر کی سائنسی حقیقت کو اس خوبی سے شعری متن کے وجود میں تحلیل کرتی ہے کہ وجود کے فطری اور حقیقی معنی دوسرے وجود سے لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں جس کی تمثیل اس متن میں وجود کے مجسمے میں تقلیب سے پیش کی گئی ہے۔

وہ باتیں کر رہے ہیں
اور ہوا ساکت کھڑی ہے
گوش بر آواز
لیکن ان کی باتیں بے صدا ہیں
نا گہاں ان تین میں سے ایک کی نظریں ہوا کی سمت اٹھتی ہیں

تو وہ گھبرا کے پھر سے چلنے لگتی ہے
ہوا چلتے ہی ان کی گفتگو آواز میں تبدیل ہوتی ہے

"ایک ادھورا شعر" وجود کے اس نیم دریافت معنی کی پیش کش سے عبارت ہے جو نظم کے کردار کو ہست و نیست کے درمیان معلق ہونے کا احساس دلاتے ہوئے "نیست" "ناوقت" اور "لاکائنات" کی طرف بڑھنے کی ترغیب کا مرہوم تاثر عطا کرتی ہے کہ اس کے بغیر مکمل معنی کی دریافت ناممکن ہے۔

"کیا بشارت کے زمانے جا چکے ہیں" مذہبی تلمیحات کے تناظر کو بدلتے ہوئے ان سے معاصر صورت حال میں وجود کی بے معنویت کے تخلیقی تجربے کی پیش کش کا کام لیتی ہے "پرومیتھس کے حضور" بھی وجود کی محدود معنویت کی پیش کار ہے "اندھیرا بسر کرنے والے کی کتھا" "تعبیر" "ٹریجڈی" اور "برزخِ یک خواب" کے متون وجود کی معنویت ہی کے مسئلے کو پیش کرتے نظر آتے ہیں ان نظموں کے متون میں خواب کو معنویت وجود کے استعارے کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور اس کے گرد لایعنیت کی ایسی فضا تخلیق کی گئی ہے جس میں زندگی اور موت مترادفات کی صورت اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔

یہاں سب اک عجب سی کیفیت میں ہیں
اک ایسی کیفیت میں
لوگ جس کو برزخ یک خواب سے تعبیر کرتے ہیں

....

ہوا جو زندگی ہے
سانس لیتی زندگی
شاید پلٹ کر آنہ پائے
اور ہم سب جو، ابھی خوابوں میں زندہ ہیں

انھی خوابوں میں مر جائیں
مگر یہ بھی تو ممکن ہے
کہ ہم سب مر چکے ہوں
اور ہمارے خواب زندہ ہوں

(برزخِ یک خواب)

ان نظمیہ متون کے ساتھ اگر "بلاعنوان" کو بھی شامل کر لیا جائے تو معاصر صورت حال کے حوالے سے ان نظمیہ متون کے بنیادی کردار کا فکری اور جذباتی ردِعمل سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور وہ پس منظر سامنے آتا ہے جس نے اس کردار کے لیے وقت کے وسیع جغرافیے میں سفر کرتے ہوئے وجود کی حقیقی معنویت کی تلاش لازم کر دی ہے۔

"پوچھیے ہم سے بتا سکتے ہیں ہم"، "تشکیک جزوِ ایماں ہے"، "اک بے نام بستی کے کچھ مناظر"، "یہ آگ جدا جدا لگی ہے"، "دوسرا جنم" اور "شبھ گھڑی" کے متون وقت اور ناوقت کے منطقوں میں وجود کے معنی کو ایک دوسرے کے وجودی معنی کے تعین کے ذریعے سمجھنے کی کوشش سے عبارت ہیں جس میں کائناتی ہم سفری کے ساتھ لاکائناتی ہم سفری کی خواہشیں اور آرزوئیں بھی شامل ہیں اور اس دوسرے کے وجودی معنی کے عدم تعین کا اعتراف بھی، جس پر تشکیک ان متون کے بنیادی کردار کے وجودی معنی و معنویت کے عدم تعین پر دال ہے تاہم یہ متون اس دوسرے کی اہمیت کا بھرپور تاثر ابھارتے ہیں جس سے کسی "شبھ گھڑی" کے وصال نے ان کے بنیادی کردار کیلئے معرفت وجود کے تمام در وا کر دیے تھے مگر پھر وہ "شبھ گھڑی" اساطیر میں بدل گئی، لہٰذا اب ان نظمیہ متون کا بنیادی کردار اس دوسرے کے وصال کے لیے دوسرے جنم کا خواہش مند ہے کیوں کہ اس دوسرے کا وجود ہی اس پر وقت اور ناوقت کی سرحدوں کے نکتۂ اتصال کا انکشاف کرتا ہے اور اسے یہ احساس دلاتا ہے کہ یہ دوسرا اس کے لیے وقت کے اس لامتناہی تصور کے مترادف ہے جس کے اندر اترنا اس کے لیے ممکن بھی نہیں اور اس کے

لیے لازم بھی ہے۔

وقت کے آگے تو جا سکتے ہیں لیکن
وقت کے اندر اُتر سکتے نہیں
اس گلی سے ہم گزر سکتے نہیں

(پوچھیے ہم سے بتا سکتے ہیں ہم)

ان نظمیہ متون کا طائرانہ تجزیہ یہ باور کرانے کیلئے کافی ہے کہ اختر رضا سلیمی انفرادی منطقۂ پر اسراریت کے حصول میں کام یاب ٹھہرا ہے یہ متون اولین قرأت پر ہی یہ احساس دلانے لگتے ہیں کہ ان کا رنگ ڈھنگ اور نا ک نقشہ دوسرے نظم گو شعراء کے متون سے مغائرت کے بے شمار حوالے رکھتا ہے۔مگران حوالوں میں سب سے ممتاز حوالہ ایک جداگانہ فکری نظام بنتا ہے معاصر نظم گو شعراء میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کا تخلیقی سفر بعض بنیادی استفہامیوں کی روشنی میں طے ہوا ہو اور وہ شاعر تو بہ طور خاص ناموجود ہیں جن کی جملہ شعری اصناف ان کی شخصیت کو کلیت عطا کرنے والی فکر سے ضو یاب ہوتی ہوں۔اس اعتبار سے اختر رضا سلیمی معاصر زمانے میں اپنے منتخب رستے پر سفر کرنے والا اکیلا شاعر ہے۔یہاں میرا مقصود یہ ہر گز نہیں کہ وہ دوسرے شعراء پر برتر ہے بلکہ میرا قصد صرف اتنا ہے کہ وہ تخلیقی عمل کے اجزائے ترکیبی کی نسبت ترکیبی کے لحاظ سے اپنے معاصرین میں ممتاز حیثیت کا حامل ہے لیکن غزل کی طرح اس کی نظم کے امتیاز و انفراد کا ادراک بھی سہل نہیں کیوں کہ وہ انفراد و امتیاز کے رواج پذیر پینتروں سے کام نہیں لیتا اور نہ اس پر دوسروں سے مختلف نظر آنے کی دھن سوار ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ اپنا کام پوری سنجیدگی اور دیانت سے کرتا ہے اس کی غزل اور اس کی نظم اس کے فنی اور صنفی شعور کی بالیدگی کا ثبوت دیتی ہے اور ان اصناف کے برتاوے میں اس نے انتہائی میانہ روی سے کام لیتے ہوئے ہر طرح کی بے اعتدالی سے دامن بچایا ہے۔

اختر رضا سلیمی کو معاصر زمانے میں رائج بیانیوں سے اپنی فکری عدم مطابقت کا قوی احساس

ہے وہ ان رائج بیانیوں کے زیر اثر صورت پذیر ہونے والی صورت حال پر بے اطمینانی بھی محسوس کرتا ہے اور غم و غصے کا اظہار بھی کرتا ہے مگر وہ صرف یہیں تک محدود نہیں رہتا بلکہ موجودہ صورت حال کے پس پردہ موجود حقائق پر غور و فکر کی کوشش کرتا ہے یہی کوشش اسے انفرادی تجربے کی اہمیت سے آگاہ کرتی ہے لیکن اس جانب پیش رفت کے لیے وہ جن مسائل سے دو چار ہے وہ انھیں نظر انداز کرتے ہوئے تخلیقی کارگزاری میں مصروف نہیں ہوتا لہٰذا وہ انفرادی تجربے کے اظہار کی منزل تک رسائی کے لیے اپنے مسائل کو اپنا تخلیقی محرک بنالیتا ہے اور اپنے غور و فکر کے عمل میں اپنی شاعرانہ دانش اور اپنی قوت تخیل کو بھی ساتھ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے نظمیہ متون کی جزئیات نگاری، منظر بندی اور طرز استدلال خالصتاً شاعرانہ یا خالصتاً علمی حیثیت اختیار نہیں کرتے بلکہ ایک ایسے قالب کا احساس دلاتے ہیں جس میں دو وجود اس طرح باہم ایک ہو گئے ہوں کہ ان کی ثنویت کا احساس ہونے کے باوجود منطقی طور پر ان کی وحدت کی تردید نہ کی جا سکے۔

اختر رضا سلیمی کی شاعری جس شاعرانہ شعور کا پتا دیتی ہے اس میں فکر و فن ظرف و مظروف کی طرح باہم یک جا نہیں ہوتے بلکہ پانی کی برف میں تقلیب کی طرح ایک ہو جاتے ہیں۔ اس تناظر میں اس کے بھی نظمیہ متون تجزیہ کیے جا سکتے ہیں مگر یہاں صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

تیرگی کی شمع جلتے ہی فلک روشن ہوا
اور امڈ آیا ستاروں کا ہجوم
آنکھ جو دن کے اندھیرے میں
فقط موجود دنیا دیکھ سکتی تھی
اب اس کی دسترس میں وہ جہاں بھی آ گئے ہیں
جو ہزاروں سال پہلے مٹ چکے ہیں

یہ جو اک منظر مری آنکھوں میں آٹھہرا ابھی
یہ وہ منظر ہے
جو میرے رفتگاں کے رفتگاں سے بھی
بہت پہلے سفر میں تھا
مگر ان تک پہنچ پایا نہیں
عین اس لمحے وہاں سے
اور اک منظر روانہ ہو رہا ہے
سوچتا ہوں
کیا اسے بھی دیکھنے والا مرے آئندگاں میں سے کوئی موجود ہوگا

(یہ وہ منظر ہے)

یہ نظم اس استفہامیے پر غور و فکر سے عبارت ہے کہ ہم جس کائنات کو دیکھتے ہوئے رفتگاں کی موجودگی کا احساس کر سکتے ہیں کیا وہی کائنات ہماری موجودگی کا احساس آئندگاں کو بھی منتقل کر پائے گی؟ مگر اس استفہامیے کی مکمل اور جلی موجودگی کے باوجود یہ متن صرف اس استفہامیے تک محدود نہیں بلکہ آنکھ اور منظر کے مابین معرفت کے رمزہائے کثیر اور روشن اندھیرے اور تاریک روشنی کے پیراڈاکس اس نظمیہ متن کی اس شعری حیثیت کو دوام دیتے ہیں جس کے بغیر اس استفہامیے کی شعری تقلیب ناممکن تھی مگر یہ تقلیب صرف اس استفہامیے کی پیش کش سے عبارت نہیں بلکہ اس کے ذریعے اس کی ابعاد کو کثرت آشنا کرنے کی سعی کی گئی ہے اور اس نقش کو ثبت کیا گیا ہے جسے اُس نے ''منظر اک بلندی پر'' میں نظر کے دستخط سے تعبیر کیا ہے۔ اختر رضا سلیمی کی تخلیقی کارگزاری اس کی نظر کا دستخط ہے جسے وہ معاصر تاریخ کے صفحات پر ثبت کر رہا ہے مجھے پورا یقین ہے کہ اس کی نظر کا دستخط اپنا انفرادقائم کرے گا اور اس کے ذریعے وہ آئندگاں کو اپنی موجودگی کا احساس دلائے گا لیکن اس وقت تک روشن اندھیرے اور تاریک روشنی کے پیراڈاکس

کا تناظر بدل چکا ہوگا اور اختر رضا سلیمی کی شاعری اپنے قارئین سے نیا مکالمہ پیدا کر رہی ہوگی اور وہ اس خواب پیچیدہ کے مقابل ان ہی خواہشات کا اظہار کر رہے ہوں گے جس کا اظہار اختر رضا سلیمی نے اپنے پیچیدہ خواب کے مقابل رقم کیا ہے۔

اے خواب پیچیدہ مرے یوں کھل کبھی
جس طرح سو کھے بیج پر رمزِ نمو
جیسے کسی مومن کے دل پر آیت لاتقنطو
اور فلسفی کے ذہن پر یہ کائنات سو بہ سو

(اے خواب پیچیدہ مرے)

اختر رضا سلیمی کی شاعری کا خواب پیچیدہ آئندگاں پر کھل سکے گا یا نہیں؟ اس کا جواب اردو ادب کے مستقبل اور آئندگاں کی ادبی دیانت اور سنجیدگی سے وابستہ ہے تاہم اتنا ضرور ہے کہ اختر رضا سلیمی نے اپنے رفتگاں کا خیر مقدم کیا ہے اس لیے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ موجودگاں اور آئندگاں اس کا استقبال کریں گے۔

دانیال طریر
کوئٹہ
۱۸ ستمبر ۲۰۱۲ء

اختر رضا سلیمی کی نظمیں

(طویل مضمون سے اقتباس)

۔۔۔۔اس مجموعہ کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن کے ساتھ میں نے اپنی مطالعہ گاہ میں گزشتہ کئی ہفتوں کی کتنی ہی ساعتیں بسر کیں اور ہنوز، ان کے سحر میں گرفتار ہوں۔ اختر رضا سلیمی کی نظم اپنی ہیئت اور تکنیک میں بڑی متنوع اور موضوع کی سطح پر بہت ثروت مند ہے۔ نظموں کا یہ مجموعہ، بلاشبہ معاصر اردو نظم کے سرمایہ میں ایک وقیع اضافہ ہے اور میری دانست میں اس کا سبب اختر رضا سلیمی کا اردو کلاسیک کا باقاعدہ مطالعہ اور زبان و بیان سے قرار واقعی آشنائی ہے۔ سچ کہوں، تو مجھے اختر رضا سلیمی بطور نظم گو، اپنی غزل پر حاوی آتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس کی نظموں میں موضوعات کا تنوع قابلِ رشک ہے۔ بنظرِ غائر دیکھا جائے تو کہیں اس کی نظم حسن کے کم نمود و کم اظہار ہونے کی حکایت کرتی نظر آتی ہے تو کہیں علامتی و استعاراتی سطح پر حالیہ سماجی و سیاسی منظرنامہ کو بیانیہ دیتی ہوئی، کہیں ''من نیم او ست'' (وحدۃ الوجود) کے اثبات کی ایک نئی صورت سامنے آتی ہے تو کہیں جدید سائنسی نظریات اور قدیم شاعرانہ تصورات کے تال میل سے تاریکی اور نامعلوم کا پر اسرار تعلق منکشف ہوتا ہے۔ زمان و مکان کی ابدیت، اثباتِ مرگ، اساطیری و داستانی تناظرات، حیات بعد الموۃ، متصوفانہ مضامین کی نو تشکیل، موجود اور ماقبل کے مابین انسلاک، تحریف کے پردہ میں تزئین، وقت (زمان) میں مسافرت کی خواہش، اپنے پیش رووں کے ساتھ ربط ضبط کی عکاسی ۔۔۔ ایسے نہ جانے کتنے ہی وقیع موضوعات ہیں، جو اس کے ہاں نظم کی فکری اساس بنتے نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

(ضیاالمصطفیٰ ترک)

میں کسی شفاف منظر پر
نظر سے دستخط کر کے ابد آثار ہونا چاہتا ہوں
ایسا کسی منظر پہ جو پہلے کسی بھی آنکھ پر اترا نہ ہو

منظر اک بلندی پر

میں کھڑا ہوں وادیِ خوش خواب میں
اور میرے چار جانب دور تک پھیلی ہوئی ہے
منظروں کی کہکشاں
اور منظروں پر ثبت ہیں
ان دیکھنے والوں کی نظروں کے نشاں
جو یہاں سے جا چکے ہیں
منظروں کی دوسری جانب
جہاں سے لوٹ کر کوئی کبھی آیا نہیں
وہ جا چکے ہیں

اپنے ہونے کی مکمل داستاں اِن منظروں پر ثبت کر کے
میں بھی اک منظر پر اپنا آپ لکھنے آیا ہوں
لیکن کہاں لکھوں

یہاں
سب منظروں پر گرد ہے
گزرے ہوئے لوگوں کی بینائی کی گرد
میں کسی شفاف منظر پر
نظر سے دستخط کر کے ابدآثار ہونا چاہتا ہوں
ایسا اک منظر پہ جو پہلے
کسی بھی آنکھ پر اترا نہ ہو

تغیر

دوبارہ ملنے کا وعدہ نہ کر مرے ہم سن
دوبارہ ملنا کسی طور بھی نہیں ممکن
ہر آتا پل نئے امکان کی بشارت ہے
مرا وجود اسی تغیر سے عبارت ہے
میں وہ نہیں ہوں جو کچھ دیر پہلے تجھ سے ملا
دوبارہ ملنے کا وعدہ نہ کر مرے ہم سن

یہ لہر جس پہ یہ کشتی رواں دواں ہے ابھی
ابھی ابھی تو یہیں تھی مگر کہاں ہے ابھی
ہزار بار بھی گر ہاتھ ہم بڑھائیں گے
ہم ایک لہر کو دوبار چھو نہ پائیں گے
دوبارہ ملنے کا وعدہ نہ کر مرے ہم سن

پھر اس مقام پہ بالفرض آ بھی جائیں تو
ہم اس ندی میں دوبارہ اتر بھی پائیں تو
یہ آبِ نیل گوں سارا بدل چکا ہو گا
یہ لمحہ حال کا ماضی میں ڈھل چکا ہو گا
دوبارہ ملنے کا وعدہ نہ کر مرے ہم سن

یہ ایک لمحہ جو اب تک ہمارے ہاتھ میں ہے
اسے بسر کریں جب تک ہمارے ہاتھ میں ہے
کہ ڈھلنے کو ہے یہ کچھ دیر بعد رفتہ میں
رکھا ہے کس نے قدم ساعتِ گذشتہ میں
دوبارہ ملنے کا وعدہ نہ کر مرے ہم سن

سرور و کیف کے یہ سلسلے کوئی دم ہیں
ہم اگلے پل وہ نہیں ہونگے جو ابھی ہم ہیں
یہ وقت ہے کہ ہم اک دوسرے پہ وا ہو جائیں
دوبارہ ملنے تلک جانے کیا سے کیا ہو جائیں
دوبارہ ملنے کا وعدہ نہ کر مرے ہم سن

ایکــــ کہانی

پہاڑوں سے گھری وادی میں، پتھر سے بنی اکــــ چاردیواری
اوراس دیوارکے اندر کئی کمرے
ہزاروں سال کی ویرانیاں اوڑھے کھڑے ہیں
انہی ویران کمروں میں سے اکــــ کمرہ
جہاں تین آدمی اکــــ چارپائی پر
خوداپنے آپــــ سے باہر نکل کراس طرح بیٹھے ہوئے ہیں
جیسا پنے آپــــ میں تھے ہی نہیں
وہ تین ہیں

بس تین
اور چوتھا مجسمہ ہے
جو باہر ایستادہ ہے
ہر اک شے پر اندھیرے
اور اندھیرے پر سسکتی خامشی کا خوف طاری ہے
مگر وہ تینوں روشن ہیں
مکمل طور پر روشن
نہ اُن پر خوف کا سایہ
نہ کوئی حُزن کی پرچھائیں
وہ باتیں کر رہے ہیں
اور ہوا ساکت کھڑی ہے
گوش برآواز
لیکن اُن کے باتیں بے صدا ہیں
نا کہاں اُن تین میں سے ایک کی نظریں ہوا کی سمت اُٹھتی ہیں
تو وہ گھبرا کے پھر سے چلنے لگتی ہے
ہوا چلتے ہی اُن کی گفتگو آواز میں تبدیل ہوتی ہے
اور اس کی تیز لہریں صحن کی جانب لپکتی ہیں

تو اک سایہ سالہراتا ہے
سایہ دیکھ کر اُن تین میں سے ایک
مارے خوف کے اپنے بدن کو اوڑھ لیتا ہے۔۔۔۔۔
دوسرے دن
صبح جب خورشید کی کرنوں نے دروازے پہ دستک دی
تو کمرے میں وہ دو تھے
اور۔۔۔۔۔
باہر دو مجسمے"

* دانستہ

شبھ گھڑی

وہ مجھے
تیرھویں ماہ کے ساتویں ہفتے کی
آٹھویں شب کے دسویں پہر میں ملا
کئی یُگ اکٹھے بتانے کے بعد
ایک دِن
ہم اک دوسرے سے جدا ہو گئے
اُس نے جاتے سمے
پھر اسی شبھ گھڑی میں دوبارہ ملاقات کا عہدنامہ لکھا
مگر وقت نے پھر ملن کی اجازت نہ دی
اور وہ عہدنامہ اساطیر میں ڈھل گیا

کیا بشارتـــــ کے زمانے جا چکے ہیں

مرا موسیٰ کہیں پیغمبری لینے گیا تھا
آگـــــ لے کر آ گیا ہے
ادھر آبادی پر پیغمبری وقتـــ آ پڑا ہے
مری بستی کے سارےـــ آدمی
جادوگروں کے سحر میں ہیں
انہیں ابـــ رسیاں بھی سانپـــ لگتی ہیں
لہٰذا سر بہ سجدہ ہیں

مرا ہارون کوہِ خامشی پر چلہ کش ہے
اور اس پر مصلحت کی وحی نازل ہو رہی ہے
بس اک لاٹھی مرا واحد سہارا تھی
مگر وہ بھی بجائے اژدہا بننے کے ان شعلوں کا ایندھن بن گئی ہے
جو موسیٰ ساتھ لایا ہے
تری لاٹھی
وہ بے آواز لاٹھی اب کہاں ہے
کیلاشا رت کنے مانے جا چکے ہیں

شجر وسیلہ ہے

دعا سبز چھاؤں ہے
اور مستجابی فقط پیڑ ہی کے وسیلے سے ممکن ہے سب جانتے ہیں
مگر آدمی نے اُسی پیڑ کو،
جو دعاؤں کو آلودگی سے بچا کر فلک سے پرے،
نیلگوں آب پر، تیرتے عرش تک لے کے جانے پہ مامور تھا،
کاٹ ڈالا ہے

حالانکہ یہ پیڑ ممنوعہ ہرگز نہیں تھا
سبھی جانتے ہیں
کہ گوتم نے دھیان اور نروان کے بیچ کا فاصلہ
پیڑ کی گود میں طے کیا تھا
خدا نے شجر کے وسیلے سے ہی ہم کلامی کا اعزاز موسیٰ کو بخشا تھا
جب زکریاؑ پر زمیں تنگ ہونے لگی
تو شجر ہی نے سینہ کشادہ کیا تھا
جسے کاٹ ڈالا گیا
ابن مریم کو مصلوب کرنے کی خاطر،
وہی ابنِ مریم کہ
جو سدرۃالمنتہیٰ سے پرے کے مسافر کی جب جب بشارت سناتا
تو ہر مردہ دل زندگی کا نیا لمس پاتا،
مگر کب تلک وہ بریدہ شجر کی صلیبیں اٹھاتا؟
سو اک دن وہ اپنی صلیبیں اٹھائے ہوئے
آسماں کی طرف چل دیا
اور شجر کاٹنا مشغلہ بن گیا
تو دعا گرد آلود ہونے لگی

خدا پاک ہے جب ہر آلودگی سے
تو آلودگی کے غلافوں میں لپٹی دعا کیوں سنے
سو ہماری دعائیں
اب اوزون کی تہہ کی درزوں میں اٹکی ہوئی منتظر ہیں
نئے پیڑ اُگنے کی
اور مستجابی فقط پیڑ ہی کے وسیلے سے ممکن ہے، سب جانتے ہیں

نا وقت میں اثباتِ وجود

کل کنجِ شگفتِ جاں میں میری
کچھ دیر کو آنکھ لگ گئی اور
چپ چاپ گذر گیا وہ لمحہ
صدیوں سے میں جس کا منتظر تھا
جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا
ہر سمت شے کی دھجیاں تھیں
شیرازۂ وقت منتشر تھا
لیکن مَیں وجود پر مُصِر تھا

دائرہ

میں پہلی بار اگرچہ یہاں پہ آیا ہوں
ہر ایک چیز مگر دیکھی بھالی لگتی ہے
سبھی نظارے یہاں کے ہیں آشنا مجھ سے
یہ جانتے ہیں مرے بارے میں، ہوا مجھ سے
میں پہلی بار اگرچہ یہاں پہ آیا ہوں

یہ جھرنا پانی کا جو بہہ رہا ہے تیــزی سے
ہے آشنا مری آنکھوں کی خوابــــِ ریزی سے

گل آج دیکھ کے مجھ کو یہاں یوں کھل رہے ہیں
کہ جیسے مدتوں کے بعد دوستــــِ مل رہے ہیں

گیــاہِ ســبز بچھی جا رہی ہے پاؤں میں
بلا رہے ہیں مجھے پیڑ اپنی چھاؤں میں
میں پہلی بار اگرچہ یہاں پہ آیا ہوں

یہ دل فریبــــِ خموشی، سکون، تنہــائی
فریفتہــِ ہے دل و جاں سے جن پہ رعنــائی
سـنا رہے ہیں مجھے نغمہ ء شناسـائی
میں پہلی بار اگرچہ یہاں پہ آیا ہوں

میں پہلی بار یہاں آیا ہوں تو ممکن ہے
کہ مجھ سے پہلے مرے رفتگان میں سے کوئی

یہاں پہ آ کے رکا ہو برائے نظارا
اور اس نے اتنی توجہ سے ان کو دیکھا ہو
کہ آج مجھ کو بھی دیکھے ہوئے سے لگتے ہیں

یہ کیا بعید کل آئندگان میں سے کوئی
یہاں پہ آئے تو جائے یہ گنگناتے ہوئے
"میں پہلی بار اگرچہ یہاں پر آیا ہوں
ہر ایک چیز مگر دیکھی بھالی لگتی ہے"

موت

میرے اس کے درمیاں
بس لمحہ بھر کا فاصلہ تھا
جس کو میں نے
عمر بھر میں طے کیا

تجسیم

میں سمندر کنارے کھڑا
اپنے موجود کو رفتہ کے خال و خد سے ملا کر
کوئی شکل ترتیب دینے میں مصروف تھا
عصر کا وقت تھا
اور سمندر ابھی سے کوئی راز اُگلنے کو بےتاب ہونے لگا تھا
مگر اُس کے ہونٹوں پر مہرِ سکوں ثبت تھی
آسماں پر سلگتے ہوئے مہر کا روشن انگارہ
اب چند ہی ثانیوں میں سیہ کوئلے میں بدلنے لگا تھا
پاؤں سے ریت،

ہاتھوں سے لمحے مسلسل پھسلتے چلے جا رہے تھے
سرمئی شام کی آنکھ میں
جب سیہ رات کی اک سلائی پھری
چاند افق سے نمودار ہو کر مری سمت دوڑا
یہاں تک کہ اُس کی طرف دیکھنے کے لیے
آنکھ کو سر پہ رکھنا پڑا
دودھیا چاند کی چاندنی ریگِ ساحل کو موتی بنانے لگی
ایک سرشاری میری رگوں میں در آنے لگی
اُس نشے میں کسی اور ہی لہر میں تھا
اچانک سمندر نے انگڑائی لی
اور پھر اُس کے سینے سے اک لہر ابھر کر
مری سمت دوڑی
مجھ تک آتی ہوئی لہر کو دیکھ کر
کوئی شے میری 'میں' سے کٹی
میری تنہائی کچھ قوس پیچھے ہٹی
لہر کچھ سوچ کر مسکرائی
مرے پاؤں چھو کر مجھے ایک گُھٹ تھمائی

اور واپس پلٹ کر سمندر کے سینے میں گم ہو گئی
میں نے جلدی سے گٹھڑی ٹٹولی
کوئی چیز اندر سے بولی
خُدارا تجسس پہ قابو رکھو
اس تجسس نے ہر شے کی ہیئت بدل دی
یہاں تک کہ سچائی کی بھی
میں نے گھبرا کے پوچھا کہ 'تو کون ہے'
تو صدا آئی 'میں جوہرِ زندگی ہوں'
وہی اولیں خلیہ جو تیری بنیاد ہے
مَیں کبھی تُو تھا اور تُو کبھی مَیں
ہماری جدائی یہیں پر ہوئی تھی
کیا تجھے یاد ہے
میں نے جب نفی میں سر ہلایا
تو کہنے لگا:
کس طرح یاد ہو
اب تو تیری نظر منظرِ صبحِ رفتہ سے
آنکھیں چرا ہوئے

شام فردا کی اندھی گھپا پڑتی ہے
فقط اپنے فردا کو محفوظ کرنے کی خاطر
تو نے بے جان ذرے کے اسرار کھولے
اور جہاں کی تباہی کا ساماں کیا
کاش تو میرے بارے میں بھی جانتا
کاش اپنی حقیقت کو پہچانتا
میرے سینے میں بھی اک توانائی ہے
اس طرف بھی کبھی تو نظر کر
دیکھ تو میرا سینہ کبھی کھول کر
اس سے پہلے کہ فردا گذشتہ بنے
آ کبھی مجھ کو تقسیم کر
اپنی تجسیم کر

فیس بُک

میں کل رات تنہائی سے بھاگ کر فیس بُک پر گیا
تو وہاں ایک دوجے کی تنہائیاں بانٹنے والوں کی بھیڑ تھی
اور اس بھیڑ میں سب اکیلے تھے،
بالکل اکیلے
اکیلا پن ان کی تصاویر سے یوں جھلکتا تھا
جیسے وہاں لکھے لفظوں سے بے معنویت
مگر
قبل اس کے کہ بے معنویت کا یہ وائرس
فیس بک سے نکل کر مرے جسم میں پھیل جاتا

میں لاگ آف کرکے
وہاں سے اٹھا
اُٹھ کے دیوانِ غالب کی جانب بڑھا
اور طلسمِ معانی میں گم ہو گیا
مجھے سٹپٹایا ہوا دیکھ کر میرزا نوشہ گویا ہوئے:

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا
زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

اپنے آبائی مکان کے دروازے پر

اسی مکاں میں کہیں منجمد ہے وہ ساعت
جو لازمان سے مجھ کو زماں میں لائی تھی
دھڑک رہی ہے وہ دھڑکن اب اس کے سینے میں
جو میرے ہونے کی پہلی دلیل ٹھہری تھی
ہے دم بخود اسی کمرے میں اب بھی وہ آواز
سنا تھا پہلی دفعہ جس کو میرے کانوں نے
بھٹک رہے ہیں وہ الفاظ اسی فضا میں کہیں
مری زباں سے جو پہلے پہل ادا ہوئے تھے
یہیں پہ دفن ہے وہ خواب بھی کہ جس نے مجھے

جہاں کی تلخ حقیقت سے آشنا کر کے
اٹھا کے پھینک دیا اجنبی دیاروں میں
میں آج مدتوں بعد اس مکاں میں آیا ہوں
تو پاؤں رک گئے چوکھٹ پہ خود بخود میرے
میں آگے بڑھتے ہوئے ڈرتا ہوں خدا نہ کرے
قدم بجائے مکاں کے زماں میں پڑ جائے
نہالِ ہست سے میرا وجود جھڑ جائے

یہ وہ منظر ہے

تیرگی کی شمع جلتے ہی فلک روشن ہوا
اور امڈ آیا ستاروں کا ہجوم
آنکھ جو دن کے اجالے میں
فقط موجود دنیا دیکھ سکتی تھا،
اب اس کی دسترس میں وہ جہاں بھی آ گئے ہیں
جو ہزاروں سال پہلے مٹ چکے ہیں۔
یہ جو اک منظر مری آنکھوں میں آ ٹھہرا ابھی
یہ وہ منظر ہے
جو میرے رفتگاں کے، رفتگاں سے بھی

بہت پہلے سفر میں تھا
مگر ان تک پہنچ پایا نہیں
عین اس لمحے وہاں سے
اور اک منظر روانہ ہو رہا ہے
سوچتا ہوں
کیا سے بھی دیکھنے والا مرے آئندگاں میں سے کوئی موجود ہوگا؟

پوچھئے ہم سے بتا سکتے ہیں ہم

پوچھئے ہم سے بتا سکتے ہیں ہم
کونسی ساعت میں کیا ہونے کو ہے
کون، کس سے، کس جگہ، ملنے کو ہے
اور کوئی، کس جگہ، کس سے، جدا ہونے کو ہے
اِس راز سے پردہ اٹھا سکتے ہیں ہم
پوچھئے ہم سے بتا سکتے ہیں ہم
آسماں کی وسعتوں میں تیرتا پنچھی اتر کر کونسی ٹہنی پہ بیٹھے گا
یہ اندازہ لگا سکتے ہیں ہم
باغباں کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیجوں میں سے
کس بیج کو کتنا تناور پیڑ بننا ہے
اور اس کے سائے میں کس کس کو ستانا ہے
ہم سے پوچھئے
وقت کی خود ساختہ تقویم سے آگے بھی جا سکتے ہیں ہم
پوچھئے ہم سے بتا سکتے ہیں ہم

ہاں مگر مت پوچھئے گا
سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کے دل میں کون سا دُکھ پل رہا ہے
کون اس کے سرخ رخساروں پہ زردی مل رہا ہے
ہم بتا سکتے نہیں
وہ صدائیں ، جو ابھی تک خامشی کے غار سے باہر نہیں آئیں
سنا سکتے ہیں ہم
پر کسی دل میں بپا، محشر کا شورِ بےصدا
ہم سنا سکتے نہیں
وہ مناظر، جو ابھی تخلیق ہونے ہیں دکھا سکتے ہیں لیکن
آدمی کے دل پہ لگنے والے زخموں کے نشانِ بےنشاں
ہم دکھا سکتے نہیں
وقت سے آگے تو جا سکتے ہیں لیکن
وقت کے اندر اتر سکتے نہیں
اس گلی سے ہم گذر سکتے نہیں

(نعمان فاروق کے لیے)

اندھیرا

میں شب کے باغ کا گلاب
میری پتیاں ہیں کائنات کو محیط
مجھ کو دیکھنے کے واسطے نظر کی شرط بھی نہیں
چراغ و ماہتاب میرا کیا بگاڑ پائیں گے
کئی ستارے میری پتیاں بکھیرنے کے شوق میں
مرے وجودِ مشکبو میں ڈھل گئے
بلیک ہول بن گئے
بلیک ہول...
میری پتیاں
مشامِ کائنات جن کی خوشبوؤں سے عطر بیز

احتمال

عین ممکن ہے
کہ ہم سب مٹ چکے ہوں
لیکن اپنے آپ سے اتنے زیادہ فاصلے ہوں
کہ ہم تک اپنے ہونے کی خبر معدومیت کے بعد پہنچی ہو

اک بےنام بستی کے کچھ مناظر

(بحر میں دانستہ ایک رکن کی کمی بیشی روا رکھی گئی ہے)

شہر سے دور اک بستی جس کا کوئی نہیں ہے نام
اور یہ ساری بستی بے دیوار و سقف و بام

یہاں زمین وہی ہے لیکن، کچھ ایسی زرخیز
یوں لگتا ہے جیسے یہاں کی خاک ہے خواب آمیز

دھرتی پر جو پاؤں رکھو تو نقشِ پا کی بجائے
قدم اُٹھانے سے پہلے ہی پھر سبزہ اگ آئے

اور فلکــــ شفــافــــ ہے ایسا آنکھ اُٹھاؤ تو
وہ بھی دکھائی دیتا ہے موجود نہیں ہے جو

وہی فضا ہے یہاں بھی لیکن شور سے ایسی خالی
کانوں میں رس گھولتی پھرتی ،میرے ،ہریالی

ہریالی کی سرگوشی میں ہے اکــــ ایسی تان
تان سین بھی سن کر جس کو رہ جائے حیران

دور افق پر تیر رہے ہیں پنچھی پر پھیلائے
جو بھی یہ منظر دیکھے وہ دیکھتا ہی رہ جائے

اکـــ ٹہنی پر جھوم رہے ہیں ایکـــ کلی اکـــ پھول
اور آنکھوں میں پھیل رہی ہے گزرے وقتـــ کی دھول

لرز رہے ہیں کلی کے سینے پر شبنم کے موتی
یہ منظر کچھ اور بھی جچتا ، ساتھ اگر تو ہوتی

ایک ادھورا شعر

مرا ایک مصرعہ کہیں کھو گیا تھا
اُسے میں نے ڈھونڈا
کتابوں میں، خوابوں میں
پھولوں میں
تتلی کے رنگوں میں
دوشیزگی کی امنگوں میں
اک دلربا میں
خدا میں

مگر میں ہمیشہ ہی ناکام لوٹا
وہ مصرع جسے ڈھونڈنے میں مجھے زندگی خرچ کرنا پڑی
آج اچانک در ذات مجھ پر کھلا، تو کھلا
وہ مصرع مری ذات کے تنگ و تاریک گوشے میں
الجھی ہوئی سانس کے ایک ریشے میں پیوست ہے
سانس کے اُس طرف نیست ہے
اِس طرف ہست ہے
اور میں نیست اور ہست کے درمیاں
گومگو کی عجب کیفیت میں کھڑا سوچتا ہوں
کہ اس شعر کو میں مکمل کروں یا نہیں
اے مرے ہم نفس مشورہ دے مجھے
آنے والا کوئی سانس اب میں بھروں یا نہیں

⊙⊙⊙

پرومیتھیس کے حضور میں

اے مرے آگ کے دیوتا!
یہ جہان ایک آتش کدہ بن چکا
میں گذشتہ کئی سال سے
تیری لائی ہوئی آگ میں جی رہا ہوں
مرے پھیپھڑے
آگ میں سانس لینے کے عادی ہوئے
آگ جو موت تھی رفتہ رفتہ مری زندگی بن گئی
آگ میں پلنے والے سمندر کی مانند میرا بدن

اب بغیر آگ کے راکھ کا ڈھیر ہے
آگ بجھنے لگے تو رگوں میں لہو جمنے لگتا ہے میرا
سو میں زندگی کی تمنا لئے
دست بستہ تری بارگہ میں کھڑا، منتظر ہوں
کسی سانحے کا
کہیں بم پھٹے تو
میں تازہ خبر کی حرارت سے اپنے بدن کو حرارت مہیا کروں
آگ ہی اب مری زندگی ہے
اے مرے دیوتا!
آگ کے دیوتا
آگ اگلتی ہوئی کوئی تازہ خبر

◉◉◉

برزخِ یک خواب

یہاں سب سو رہے ہیں
اور ہوا بادل کی کشتی میں اک ان دیکھے جزیرے کو روانہ ہے
ہوا جو زندگی ہے
اب اُس کو روکنے والا یہاں کوئی نہیں ہے
یہاں سب اک عجب سی کیفیت میں ہیں
اک ایسی کیفیت میں،
لوگ جس کو برزخِ یک خواب سے تعبیر کرتے ہیں
اک ایسا برزخِ دو در

کہ جس کا ایک در ہستی کی لیکن دوسرا در نیستی کی سمت کھلتا ہے
ہمیں کس سمت جانا ہے
اب اس کا فیصلہ بھی اُس ہوا کے ہاتھ میں ہے
جو
اک ان دیکھے جزیرے کو روانہ ہو چکی ہے
ہوا جو زندگی ہے
سانس لیتی زندگی
شاید پلٹ کر آ نہ پائے
اور ہم سب جو ابھی خوابوں میں زندہ ہیں
انہی خوابوں میں مر جائیں
مگر یہ بھی تو ممکن ہے
کہ ہم سب مر چکے ہوں
اور ہمارے خواب زندہ ہوں

اداسی اور دکھ منظر بدلتے ہیں

یہاں ہر شے ہماری سوچ اور جذبے کے تابع ہے
بظاہر کوئی تبدیلی نہیں ہوتی
مگر پل بھر میں سب کچھ یوں بدلتا ہے
کہ ہونی اور ان ہونی فریب محض لگتے ہیں
ابھی کچھ روز پہلے ہم یہاں آئے
تو یہ منظر کہ جس کی کرچیاں اس وقت
میری آنکھ کے رستے مرے دل میں اترتی جا رہی ہیں
ہمیں کتنا لبھایا تھا
خوش آیا تھا
یہاں کچھ بھی نہیں بدلا
مگر سب کچھ۔۔۔

اے اسیر ازل

اے سفیرِ ابد
اے اسیرِ ازل
وقت سیلِ اجل
اس کی رو سے نکل
روشنی کے سراپے میں ڈھل
اور مرے ساتھ چل
ایک ایسے جہاں میں
جہاں آج ہے اور نہ کل

مستقبل کو یاد رکھنے کی خواہش

یہ ماضی، حال، مستقبل سبھی تیرے زمانے
ترا فرمان ہے:
"میں خود زمانہ ہوں"
لہٰذا تو زمانہ ہے
تری آنکھوں پہ آئینہ ہیں
ماضی، حال، مستقبل کے یہ سب آئنہ خانے
سب افسانے
مگر میرا مقدر
گئے گزرے زمانے

مری پلکوں کی درزوں سے جھلکتے ہیں
وہی لمحے پرانے
مراد کھ کون جانے
مری آنکھوں میں ماضی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
اگر ہے بھی تو مستقبل کا اندیشہ
ولیکن میں جنوں پیشہ
تجھے اچھا برا کہنے نہیں آیا
بس اک لمحے کی خواہش دامنِ دل میں سمیٹے
عجز سے چہرہ لپیٹے
یہاں حاضر ہوا ہوں
بس اک لمحہ ازل گیر و ابد آثار لمحہ
جو مستقبل کو ماضی سے ملا دے
مرے فردا کو رفتہ سا بنا دے
کہ میں فردا کو رفتہ کی طرح آباد رکھنا چاہتا ہوں
یا د رکھنا چاہتا ہوں

بے ہیئتی کی ہیئت

خیال اس کا آتے ہی بدن لرزنے لگتا ہے
وہ جس کی کوئی شکل ہے، نہ اصل ہے
بس ایک خوفِ بے نہایت اس کے ہونے کی دلیل
مثل اس کی نے مثیل
لوگ کہہ رہے ہیں میرا وہم ہے
مگر میں کیوں یقیں کروں
وہ اک ندائے بے صدا سہی، سنائی دیتی ہے مجھے
اگرچہ اس کی سمت ہے نہ انت ہے

مگر میں جب بغور دیکھتا ہوں تو دکھائی دیتی ہے مجھے
وہ جس کا کوئی اسم ہے، نہ جسم ہے
طلسم ہی طلسم ہے
مرا وجود شاید اس کا ورد ہے
وہ اب بھی میرے گرد ہے
بغور دیکھیے ذرا
یہ میں ہوں یا وہی طلسم
میرا اسم ہے نہ جسم

⊛⊛⊛

نظم دکھ تو نہیں ہے

نظم دکھ تو نہیں ہے
جسے آپ، ہم ہر کسی کو سناتے پھریں
اور آنسو بہاتے پھریں
نظم تو خواب ہے
ایک شاعر کا خواب
جسے بس وہی آدمی دیکھ سکتا ہے
جو صبح دم خشک ٹہنی پہ لرزیدہ شبنم کے قطرے کا دکھ جانتا ہے
اور اس جاننے کے عمل ہی کو سکھ جانتا ہے

سقراط کا آخری بیان

معزز اراکینِ مجلس!
ہم اب مختلف راستوں کے مسافر ہیں
میں موت کی تنگ و تاریک گھاٹی کی جانب رواں
اور تم شارعِ زندگی کی طرف گامزن
کون سا راستہ ٹھیک ہے
یہ نہ تم جانتے ہو نہ میں
خیر تم سے مجھے کوئی شکوہ نہیں
تم تو یہ بھی نہیں جانتے ہو:
کہ تم کچھ نہیں جانتے
ہاں مگر کچھ دنوں بعد تم جان لو گے
کہ تم نے اک ایسا علیم و خبیر آدمی کھو دیا ہے
جو یہ جانتا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتا

پانچواں بُعد

ہم اب تک اسے چار ابعاد سے دیکھتے اور پرکھتے رہے
مگر ایک کہکشو نے کل رات مژدہ سنایا
کہ یہ کائنات طویل و عریض و عمیق و قدیم
پانچویں بعد سے دیکھے جانے کی حق دار ہے
اور وہ پانچواں بعد دُکھ ہے
محبت کا دُکھ
ازل سے جسے بُعد ہی راس ہے
اسی بعد نے قُربتوں کو مٹا کے ہمارے لیے حُسن کی دل کشی کو بڑھایا

یہ ہر آن بڑھتی ہوئی حسن کی دل کشی، زندگی کی علامت ہے
یہ ہجر سب کی بقا کی ضمانت ہے
وصل اک قیامت ہے
سو
قبل اس کے کہ پھر وصل آغاز ہو
ہم اسے پانچویں بعد کی معرفت سے سمجھنے کی کوشش کریں
عین ممکن ہے الجھی ہوئی ڈوریاں خود سلجھنے لگیں

ایک نظم حبسیوں کے لیے

شجر جب دعا مانگتے تھے
تو بارش زمینوں پہ رحمت کی صورت برستی
پھواریں مکانوں کے صحنوں کی مٹی پہ پڑتیں
تو خوشبو سے سانسیں مہکتیں
مہکتی ہوئی سانس اندر کو جاتی
تو آسودگی ساتھ لاتی
خزاں بُردُ ٹہنی پہ جب پھول آتے
تو لوگ اپنی آنکھیں وہیں بھول آتے

نظارے دنوں کے ستارے تھے

پھر یوں ہوا
آدمی نے شجر کاٹنا مشغلہ کرلیا
اور بارش عذابوں کی صورت برسنے لگی
بارشوں کی دعا مانگنے والے بھی، بارشیں روکنے کی دعا مانگنے
مسجدوں مندروں و کلیساؤں میں جمع ہونے لگے
مگر بارشیں سب دعائیں بہا لے گئیں
بارشوں کی دعا مانگنے والے بھی جانتے ہیں
کہ ان بارشوں کی زمام اُن درختوں کے ہاتھوں میں تھی
جنہیں کاٹ ڈالا گیا

کُن سے پہلے کا جہاں

اے دنوں کو پھیرنے والے دنوں کو پھیر دے
اور مجھ پر منکشف کر ابتدائے آفرینش سے ذرا پہلے کا منظر
کن سے پہلے کا جہاں
جو یہاں آ، جا چکے ہیں
ان سے پہلے کا جہاں
مجھ کو ماضی میں سفر کا اذن دے
میں بھی تو دیکھوں ذرا

میں نہیں تھا جب تو کیسا تھا جہانِ رنگ و بو
کیسے نظارے تھے تیرے چار سو
کیسا تھا تُو
اس جہاں کو آج میرے سامنے تیب دے
میں بھی دیکھوں
یہ حسیں دنیا ازل سے دلکش و شاداب تھی
یا اسے ایسا بنانے میں کہیں
میرا بھی کوئی ہاتھ ہے

***

البیر کامیو کے لیے
(ناول اجنبی کے حوالے سے)

شبِ ماہ میں
کامیو ایک کردار کا پیچھا کرتا ہوا میرے دروازے تک آ گیا
میں نے حافظ کے دیوان کی بالکونی سے جھانکا
تو دیکھا:
گلستان کی سمت کھلتی ہوئی کھڑکیاں بند ہیں
اور خدائے سخن محوِ مشقِ سخن ہے
میں پلٹا
اور اقبال و غالب کے مصرعوں کی پر پیچ رہداریوں سے گزرتا ہوا

کافکا کی کہانی میں داخل ہوا
اور ملٹن کی فردوسِ گم گشتہ میں جا چھپا
مجھے خدشہ تھا
کامیو چاندنی کی چبھن کا بہانا بنا کر مجھے قتل کرنے کے در پے ہے
گرچہ میں اس کے لیے اجنبی بھی نہیں تھا

حیرت زندگی ہے

آ گہی نے چھین لی ہیں
مجھ سے ساری حیرتیں
حیرتیں
جو زیست سے معمور تھیں
بھرپور تھیں
اب کسی بھی بات پر حیراں نہیں ہوتا یہ دل
کھل گئے سارے رموزِ آب و گل
زندگی پر منکشف ہے

موت کا مقسوم بھی
مفہوم بھی
اب تو ہے معلوم
نا معلوم بھی
چشمِ دل پر کھل چکے ہیں سارے راز
اب نہیں ہے میرے زندہ رہنے کا کوئی جواز

Event Horizon

میں عدم کے وقوعی افق پر کھڑا
اپنی معدومیت کے نظارے میں مشغول تھا۔
(موت ازل سے مرے واسطے واقعی مشغلہ تھی)
اچانک مرا پاؤں پھسلا
پھسلتے پھسلتے میں اِک غار میں جا گرا
غار میں ہر طرف تیرگی تھی
فقط تیرگی
میں نے گھبرا کے خود کو پکارا
مگر میری آواز مجھ کو سنائی نہ دی

اچانک مجھے یوں لگا
جیسے میرا بدن ایک احساس میں ڈھل گیا
اور زمان و مکاں منجمد ہو گئے
قرن با قرن کا یہ سفر
چند لمحوں میں طے کر کے میں
غار کی دوسری سمت پہنچا
جہاں دودھیا روشنی تھی
اور اس روشنی میں نہائی ہوئی ایک دنیا
مجھے اپنی بانہوں میں لینے کو بے تاب تھی
تب کھلا
زندگی محض اِک خواب تھی

⊙⊙⊙

کوئی وقت کو راہ پلائے

میرے اندر وقت کا دھارا الٹا بہتا ہے
آنے والا ہر اک منظر روشن رہتا ہے
مجھ کو یہ تو پتا ہے میں نے
کون سی نظم کہاں لکھنی ہے
کون سا شعر کہاں کہنا ہے
لیکن کیا کچھ کہہ رکھا ہے
کون سا چہرہ کاسہ رکھا ہے،

بھول چکا ہوں
وہ کہتا ہے میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا ملنے کا
میں نے اس سے کب ملنا ہے
مجھے پتا ہے
لیکن کیوں ملنا ہے
مجھ کو بالکل یاد نہیں
کوئی وقت کو راہ پہ لائے
میرا ماضی یاد دلائے

پسپائی
(ایک سپاہی کی آپ بیتی)

مرے خمیر میں رکھی گئی شکیبائی
مرا شعار نہیں ہے گریز و پسپائی

فریفتہ مرے قدموں پہ برق رفتاری
تفنگ و تیغ مرے بازوؤں کے شیدائی

تمام عمر مری معرکوں میں گزری ہے
مرے ارادوں میں لغزش کبھی نہیں آئی

ہر اک محاذ سے لوٹا ہوں کامیاب مگر
کل اک محاذ پہ میری ہوئی ہے رسوائی

نشانہ باندھ کے دیکھا جو میں نے سوئے ہدف
مری ہی شکل مجھے دوبدو نظر آئی

کل اپنے مد مقابل میں پہلی بار آیا
اور اپنی فتح کے نشے میں خود کو مار آیا

یہ آگ جدا جدا لگی ہے

ترے بدن کی آگ تیرے جسم کو گداز کر رہی ہے
اور اس میں بھر رہی ہے زندگی
ترے بدن کی آگ میں جو شعلگی ہے
اس سے تیرا چہرہ یوں چمک رہا ہے
جیسے چاند،
گال ایسے سرخ جیسے پھول،
ہونٹ جیسے پنکھڑی
مگر اس آگ کا دھواں مرے وجود میں اتر رہا ہے
اور میرا جسم راکھ ہو رہا ہے
راکھ ــــــ

رات

رات اک ایسا شجر
جس میں نظر
گر جھکے تو لمحۂ موجود پر
اور اٹھے تو ہزاروں سال اُدھر

☯☯☯

مگر یہ خامشی کی دُھند

چہار سمت دُھند ہے
سیاہ خامشی کی دُھند
کوئی صدائے روشنی بلند ہو تو راستہ سجھائی دے
وہ راستہ
کہ جو نشیبِ حرف سے
فرازِ لفظ کی فراخ چوٹیوں کی سمت گامزن ہے
میں کلام کی یہ پُرشکوہ چوٹیاں عبور کر کے

اُس پہاڑ تک رسائی چاہتا ہوں
جو خدا کی غیب گاہ ہے
خدا کی غیب گاہ میں
شروع سے اخیر تک
تمام واقعات اِک قدیم سنگ پر لکھے ہوئے
مری نگاہِ نے نواز کے ہیں منتظر
مگر یہ خامشی کی دُھند.....

ایک تصویر

اک پہاڑی پر گھنے پیڑوں میں اک ویراں مکاں
اور مکاں کی سمت جاتے راستے پر قدموں کے تازہ نشاں
اک طرف ڈھلوان، جس کی سمت کھلتی کھڑکیاں
جن پہ کندہ ارغوانی رنگ کے کچھ بیل، بوٹے، پتیاں
پتیوں کے گرد اڑتی خواہشوں کی تتلیاں
تتلیوں کے اس طرف اک خواب داں
خواب داں میں،
دو بدن اک دوسرے میں اس طرح پیوست
جیسے جسم و جاں،
شعلہ فشاں
ہر طرف اُڑتی ہوئی چنگاریاں
اور باہر برف باری کا سماں

ابلاغ

وہ جس نے کبھی پیڑ سے گفتگو ہی نہیں کی
اسے کیسے سمجھایا جائے
خموشی کا ابلاغ
ممکن بھی ہے
اور بھرپور بھی

اے خوابِ پیچیدہ مرے

اے خوابِ پیچیدہ مرے یوں کھل کبھی
جیسے کہانی کار پر صورت کوئی انجام کی
یا شاعرِ شعلہ نوا پر کیفیت الہام کی
یوں کھل کبھی
اے خوابِ پیچیدہ مرے یوں کھل کبھی
جیسے کسی درویش پر سرِ ازل
جیسے کسی با ذوق قاری پر غزل

الجھی ہوئی تصویر جیسے ناظرِ تصویر پر
یا زندگانی کی حقیقت میر پر
یوں کھل کبھی
اے خوابــــِ پیچیدہ مرے یوں کھل کبھی
جس طرح سوکھے بیج پر رمزِ نمو
جیسے کسی مومن کے دل پر آیتــــِ لاتقنطو
اور فلسفی کے ذہن پر یہ کائناتــــِ سو بہ سو
یوں کھل کبھی
اے خوابــــِ پیچیدہ مرے

دوسرا جنم

میں نے ہر شب اس کی صحبت میں بسر کی
لیکن اب بھی زندگی
میرے لئے اتنی ہی پراسرار ہے
جتنی کہ تھی
کیا کبھی اس راز سے پردہ اٹھا پاؤں گا میں
شاید نہیں
اس بار ممکن ہی نہیں
اس کے لئے
اک بار پھر آؤں گا میں

دو منظر

پوہ مہینہ سرد ہوا
چاروں اور برستی کہر
پچھلے پہر کا سناٹا
اور گھٹا گھنگھور
بستی میں ہے ہُو کا عالم
پر بستی سے دور
ایک کھنڈر میں جلتا دیپ، لبوں کی حدت
اور سانسوں کا شور

تعبیر

رات کو میں نے خواب میں دیکھا
میں نے سارے خواب اُٹھائے
اور انہیں
اک خواب دان میں ڈال دیا
آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا
خواب دان میں راکھ پڑی تھی
اے خواب گرو!
تعبیر بتاؤ

بلاعنوان

میں جاگا تو وہاں کوئی نہیں تھا
مرے ہمزاد سارے مٹ چکے تھے
اور ان کی ہڈیوں پر وقت کی کائی جمی تھی
مگر-----
باہر وہی منظر تھا
بستی بس رہی تھی
اور گلی کوچوں میں استبداد کا سکہ برابر چل رہا تھا

قاتل کا بیان

کل پیش عدالت یہ کہا قاتل نے
میں چیخ رہا ہوں کوئی سنتا ہی نہیں
سر کاٹنے کا مجھ پہ ہے الزام غلط
اس شخص کے شانوں پہ تو سر تھا ہی نہیں

ٹریجڈی

کہانی کے سبھی کردار گلیوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں
اور کہانی سو رہی ہے
کہانی جو، اب اپنے خوفناک انجام کی جانب رواں تھی
کہانی کار کی غفلت کے باعث سو گئی
اور اس کے سب کردار باہر آ گئے ہیں
کہانی سو رہی ہے
اور جیتے جاگتے اس شہر کی گلیاں کہانی میں بدلتی جا رہی ہیں
یہ چوراہا، جو تھوڑی دیر پہلے شہر کا حصہ تھا
اب قصہ ہے
سو یہ عین ممکن ہے، کہانی جاگ کر آگے بڑھے تو
شہر بھی اس خوفناک انجام سے دوچار ہو
جو اس کہانی کا مقدر تھا

کوئی شارع بھی، شارعِ عام نہیں ہے

ہٹا دو راہ سے سب راستوں کو
اور سب پل سیل کر ڈالو
ہر اک سگنل ہرا ہونا ضروری ہے
مگر انساں نظر آئے
تو اس کو زرد یا پھر سرخ کرنے کی اجازت ہے
اجازت ہے
فقط پیڑوں، پرندوں اور پھولوں کو خموشی سے کھڑا رہنے کی
ان میں سے بھی گر کوئی ہلے تو شوٹ کر ڈالو

خبر کر دو یہاں کے سب مکینوں کو
کوئی باہر نہ نکلے

اور۔۔۔

جو نکلے ٹھیک سے اس کی خبر لی جائے
کہ شاہِ وقت آج اپنی رعایا کی خبر گیری کو نکلیں گے

☯☯☯

سی این این

کہیں پہ اک سفید آدمی نے
راہ چلتے اک سیاہ فام شخص سے دعا سلام کی
اُسے گلے لگایا اور اس کے منہ پہ کس کیا
چنانچہ اُس کی دوست اس کو چھوڑ کر چلی گئی
اِدھر اک اور آدمی نے
اپنے پالتو بلیک ڈاگ کو پکڑ کے مارا پیٹا
لیکن اس کی بیوی نے طلاق کا مطالبہ نہیں کیا

اندھیرا بسر کرنے والے کی کتھا

یہ روشنی ہے بہر حال آنکھ کا پردہ
اسے ہٹانا ضروری ہے بیچ سے ورنہ
پہنچ نہ پاؤ گے تم دہر کی حقیقت تک
اگرچہ ایک حقیقت ہے روشنی بھی مگر
اندھیرا دہر کی سب سے بڑی حقیقت ہے
میں اس کے بارے میں تم سے زیادہ جانتا ہوں
کہ تم نے دیکھا ہے، میں نے بسر کیا ہے اسے
سمجھنا چاہتے ہو دہر کو تو سمجھو مجھے

⚪⚪⚪

میڈیا آزاد ہے

وقوعے کی خبر
سارے ہی چینلز نے
جائے وقوعہ سے براہِ راست ٹیلی کاسٹ کی تھی
اور اخباروں نے تصویروں کے ساتھ اس کو
جلی شہ سرخیوں کی شکل میں شایع کیا تھا
لیکن اگلے روز اک تازہ خبر آئی
کہ ''سرکاری ذرائع کے مطابق:
وقوعہ ہو نہیں پایا''
چنانچہ اب
ہر اک چینل کا دعویٰ ہے
کہ:
اس نے سب سے آخر میں وقوعے کی خبر دی تھی

منیر نیازی کی یاد میں

شب کی دیواروں سے پھوٹا لال لہو فوارہ
آدھی رات کو دروازے پر آ کر کوئی پکارا
او میرے ہم راز!
او میرے ہم راز!
تھوڑی دیر کے بعد آئی دروازہ کھلنے کی آواز
اور سرہانے آ کر میرے کسی نے کی سرگوشی
میرے جاگ اٹھنے سے پہلے جاگ اٹھی خاموشی
آنکھیں کھول کے دیکھوں تو اک سایہ سا لہرائے
سانس بھروں تو مرجھائے پھولوں کی خوشبو آئے
کون ہے وہ
یہ کون بتائے

تشکیکــــ جزوِ ایماں ہے

چلو یہ مان لیا گر خدا نہیں نہ سہی
سوال یہ ہے صنم بھی اگر کہیں نہ ہوئے
کدھر کو جائیں گے ہم لوگــــ جن کی پیشانی
ترس رہی ہے کسی بارگہ میں جھکنے کو
چلو یہ فرض کیا ہم نے
گر صنم نہ ہوئے
تو ایکــــ دوســــرے کو ہی خــدا بنا لیں گے
اور اپنے اپنے وجود و عدم کو پا لیں گے
مگر وجود و عدم بھی تو ہم نے فرض کیے
تو پھر سوال وہی ہے
کہ یہ وجود و عدم بھی اگر کہیں نہ ہوئے!!
خــدا نہ خواستہ ہم بھی اگر کہیں نہ ہوئے!!!

موتـــــ اکــــــ ماندگی کا وقفہ ہے

فنا کو فنا ہے بقا کو بقا
جو نہیں وہ ازل سے نہیں
اور جو ہے
وہ ہمیشہ سے ہے
ہم ہمیشہ سے ہیں

☯☯☯

اقبال لینن کے حضور میں

قصور الگ سہی برباد ایک جیسے ہیں
دمشق و کابل و بغداد ایک جیسے ہیں

ادھر یہ دعویٰ کہ دنیا غلام ہے اپنی
اِدھر یہ نعرہ سب افراد ایک جیسے ہیں

ہوا جہان میں قایم نظام جمہوری
سو اب مقید و آزاد ایک جیسے ہیں

وہی ہے ظلمتوں کا راج جو کہ پہلے تھا
ہر ایک عہد کے شب زاد ایک جیسے ہیں

بس اتنا فرق پڑا ہے کہ صید بدلے ہیں
ہیں دام ایک سے صیاد ایک جیسے ہیں

سفر ہے شرط۔۔۔

مجھ کو معلوم تھا میری باتیں تمھیں سن رسیدہ لگیں گی
مجھ پہ اکثر یہ الزام لگتا رہا ہے
کہ میں کم سنی میں، بڑی عمر کی گفتگو کر رہا ہوں
اور کئی لوگ تو اِس کو شہرت پسندی پہ محمول کرتے رہے ہیں
اِنھیں کیا خبر میں نے اِن چند برسوں میں کتنا سفر طے کیا
میں تو ایک ایک دِن میں ہزاروں برس بھی جیا
عمر کو روز و شب اور مہ و سال سے ماپنے کا طریقہ غلط ہے
مگر یہ وہی جانتے ہیں
جو اک پیکرِ خواب کی جستجو میں
زمان و مکاں کی حدوں سے ورا بھی گئے ہوں
کبھی تُم زمان و مکاں کی حدوں سے نکل کے تو دیکھو
تمہیں میری باتیں بہت چھوٹی محسوس ہوں گی

کل من علیھا فان

فسانے لکھ گیا کیا کیا وہ برگ جھڑتے ہوئے
حروف آنکھ میں چبھنے لگے ہیں پڑھتے ہوئے

شمار کیجیے اس کا شہید لوگوں میں
جو شخص مر گیا ہے زندگی سے لڑتے ہوئے

نظر جدید جہانوں کی راہداری پر
قدم قدیم زمانوں کی سمت بڑھتے ہوئے

سوائے نورِ مبیں کل من علیھا فان
بتا رہا تھا ستارہ کوئی سکڑتے ہوئے

(اظہر نقوی کی یاد میں)

ایک نعت کہنے کی خواہش میں

مولا ترے کرم کی نظر چاہیے مجھے
میں مستحق نہیں ہوں مگر چاہیے مجھے

مولا غزل کے باب میں تو نے کرم کیا
اب نعت گوئی کا بھی ہنر چاہیے مجھے

آئینہ ہو چکی ہے یہ دنیائے آب و گل
اب عرش سے ادھر کی خبر چاہیے مجھے

یہ دل اسیرِ شام و سحر ہو کے رہ گیا
اب اختیارِ شام سحر چاہیے مجھے

یہ نعت کا سفر ہے کٹھن بھی طویل بھی
جانا ہے دور، زادِ سفر چاہیے مجھے

اختراع اور ارتفاع کے بارے میں کچھ آرا

اختر رضا سلیمی اپنے اردگرد ایسے معانی تلاش کرتے ہیں جو نہ جانے کب سے موجود تھے مگر انہیں اس زاویے سے تلاش نہیں کیا گیا تھا، جو سلیمی کے حصے میں آیا۔جس زاویے سے سلیمی نے شعر کہے ہیں وہ اس کا اپنا زاویہ ہے۔میں یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس نے دیکھنے کے لیے دروازے کا روزن استعمال کیا ہے یا دوربین کو الٹی طرف سے دیکھا ہے۔منظر مانوس ہے مگر دیکھنے والی آنکھ اجنبی ہے اور یہی اجنبیت اس کا تخلیقی عمل بھی ہے اور تازہ کاری بھی۔

شہزاد احمد

غزل میں اچھا شعر کہنا چاول کے دانے پر سورہ اخلاص لکھنے کے مترادف ہے اور اختر رضا سلیمی نے یہ مشکل کام کر دکھایا۔اس نے ''ارتفاع'' کے دیباچے کے طور پر جو شعر درج کیا ہے۔اس کے شعروں کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔جہاں مضمون کا پیکر دولخت ہونے کا خدشہ ہو، وہ وہاں شکستِ ناروا کو بھی روا رکھنے کا قائل ہے۔وہ ان شعرا میں سے ہے جو زبان و بیاں کو مضمون پر ترجیح دیتے ہیں۔اس روایت کا آغاز غالب سے ہوتا ہے۔اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ غالب کی روایت کا شاعر ہے۔

ڈاکٹر توصیف تبسم

اختر رضا سلیمی کی شاعری میں فکر و احساس کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جو ہماری صدیوں کی شعری روایت کا ورثہ ہے اور نئی شاعری میں بہت کم نظر آتا ہے۔کسی تصنع اور شیخی کے بغیر اختر رضا سلیمی ایسی باتیں کہتے ہیں جنہیں ہم محسوس ہی نہیں کرتے بلکہ ان پر غور بھی کرتے ہیں۔

فہمیدہ ریاض

میں سمجھتا ہوں کہ نئے شعرا میں اختر رضا سلیمی ایک بہت ہی توانا آواز ہے۔ وہ زمانے کے اندر جھانکنے اور اپنے دکھ کو شعر کا پیکر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ غزل کا مزاج آشنا ہے۔

منشایاد

اختر رضا سلیمی کے ہاں جو سلاست اور سادگی ہے وہ انہیں دوسرے ہم عصر شعرا سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں جنہوں نے زبان کو مشکل بناتے ہوئے فارم اور مضمون کو گم کر دیا۔ سلیمی پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون انتہائی سہولت سے شعر میں سمونے پر قدرت رکھتے ہیں۔

محمد اظہار الحق

اختر رضا سلیمی بنیادی طور پر فکری شاعر ہے۔ اس مختصر مجموعے میں چالیس سے زائد ایسے شعر ہیں، جو فکری ہیں اور اختر رضا سلیمی کی عمر کے تناسب سے یہ معمولی تعداد نہیں۔

یوسف حسن



اختر رضا سلیمی کی نظمیں پڑھتے یا سنتے ہوئے ذہن میں اولین تاثر یہ بنتا ہے کہ یہ آج کی شاعری ہے۔ یعنی عالمی گاؤں کی شاعری۔ زیرِ نظر مجموعے کی نظمیں اختر رضا سلیمی کے عالمی شعور اور تخیل کا پتہ دیتی ہیں........ اختر رضا سلیمی نے اپنی نظموں میں ایسے سوال اُٹھائے ہیں جو اردو شاعری میں پہلی بار پوچھے گئے ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے....... زندگی کا بھید جاننے اور زندگی کو قبول کرنے والی یہ شاعری نئی، منفرد اور دلفریب ترکیبوں میں سامنے آئی ہے۔ آیئے اس کو خوش آمدید کہیں۔

قاضی جاوید

نظم کے میدان میں بھی اختر رضا سلیمی اتنا ہی موثر اور کامیاب ہے جتنا غزل کی جادوگری میں۔ ان نظموں میں وقت اور نا وقت آنکھ مچولی کھیلتے نظر آتے ہیں۔ کہیں وقت میں معدومیت کا احساس ہوتا ہے تو کہیں نا وقت میں اثبات وجود جھلکتا ہے۔ کہیں شب کے باغ میں گلاب کھلتے ہیں تو کہیں منظروں کی کہکشاں جھلملاتی ہے۔ دیومالائی اور تاریخی کردار نظم کے سانچے میں ڈھل کر سحر انگیز منظر ترتیب دیتے ہیں۔ میں سلیمی کو نظم کی کتاب عام کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

وحید احمد

اردو غزل میں اپنی الگ پہچان قائم کرنے کے بعد، اختر رضا سلیمی نے نظم کی طرف توجہ کی ہے۔ ان کی نظم کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس پر نہ تو غزل کی شعریات کا سایہ ہے اور نہ غزل کے مخصوص ڈکشن کا...... اختر رضا سلیمی کی نظم معاصر عہد کی ترجمانی کرنے کی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔

ناصر عباس نیرؔ